جو اپنے غول کے دیوانے تھے اب نہیں ملتے

کے۔ کے کھلّر
سی۔8، پاکٹ۔8، فلیٹ نمبر 8338، وسنت کنج، نئی دہلی۔110007

ادبی اڈّوں کا ہوائی دورہ
(موہن سنگھ پلیس کی چھت سے)

'اڈّا' جس کے لفظی معنیٰ ہیں ''بیٹھک'' کسی زمانے میں کہاروں کے جمع رہنے کی جگہ تھی۔ ڈولیوں کو اکٹھا رہنے کا مقام تھا۔ جہاں چار کہار بیٹھتے وہ جگہ اڈّا بن جاتا۔ اپنے لمبے سفر میں کہاروں کے بیٹھنے کی جگہ یعنی اُن کے آرام کرنے کا مقام اڈّا کہلاتا تھا۔ جہاں وہ بیٹھ کر نہایت میلے سے تاش سے سویپ (Sweep) کھیلتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں ہر میل پر ایک مینار ہوتا تھا جہاں کہاروں کی ڈولیوں کے علاوہ ثقافتی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ دلّی سے امرت سر تک جرنیلی سڑک پر درجنوں ایسے اڈّے آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، لیکن وہ ادبی اڈّے نہیں تھے۔

متحدہ پنجاب میں حقّے کے اڈّے لگتے تھے۔ ان اڈّوں پر دو مخالف پارٹیاں حقّے کے حق میں اور اس کے برخلاف شعری بحث کرتی تھیں۔ ایک طرف سے آواز آتی تھی۔

حُقّہ حکم خدا دا
تے چلم حقّے دی رن
جتھے حقہ دیکھئے دیے
دیے ادنوں پن
اور دوسری طرف سے آواز بلند ہوتی تھی
حُقّہ حکم خدا دا
تے چلم حقّے دی تی دو
جتھے حقّہ دیکھئے
لیے اُدنوں پی

اُتر پردیش اور ہریانہ میں حقّے کے اڈّے آج بھی لگتے ہیں۔

لیکن وہاں بوڑھے لوگ اپنی بیماریوں، بیٹوں کی بے وفائیوں اور بیٹیوں کی شادیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں، لیکن ان کو بھی ادبی اڈّے نہیں کہا جاسکتا۔ ادبی اڈّوں کا آغاز ازبکستان کے قہوہ خانوں سے ہوا جن کا ذکر بابر نے اپنی توزک میں اکثر کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں تاشقند سمرقند سے ہوتا ہوا فرغانہ پہنچا تو ان اڈّوں کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ تاجکستان میں ادبی اڈّے تھے جو اب معدوم ہو چکے ہیں۔

انگلستان میں سب سے پہلا ادبی اڈّا سیمول جانسن کی یاد دلاتا ہے۔ یہ اڈّا لندن میں تھا جس میں اس وقت کے اخبارات، رسالوں کے ایڈیٹر ہر روز آتے تھے۔ ڈاکٹر جانسن نے اس خاص اڈّے کا ذکر اپنی کتاب Lives of the poets میں بار بار کیا ہے۔ جو ایڈیٹر ادبی بحث مباحثوں میں زیادہ حصّہ لیتے تھے وہ تھے ایڈیسن اور سٹیل (Addison & Steele) اور سب سے زیادہ اہم نام ہے باسول (Boswell) کا جس نے ڈاکٹر جانسن کی سوانح لکھ کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ وہ کافی ہاؤس اور اس کی کرسی جس پر ڈاکٹر جانسن بیٹھتے تھے آج Heritage Chair ہے۔ یاد رہے کہ ٹی ایس ایلیٹ (T.S.Eliot) نے اپنی پہلی نظم Love Song of Prufrock اسی اڈّے میں پڑھی تھی۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے ان اڈّوں سے ہی فرانس کے انقلاب کا آغاز ہوا تھا جس میں والٹیر (Voltaire) ڈانٹن (Danton) اور Robespiesre پیش پیش تھے۔

ہندوستان میں یہ ادبی اڈّے شاہجہاں کے زمانے میں شروع ہوئے تھے۔ جہاں داراشکوہ اور اس کے ساتھیوں میں صوفی ازم پر بحث ہوتی تھی۔ فرانسیسی سیّاح برنیئر (Bernier) کے مطابق دلّی کے چاندنی چوک میں ۱۲ کافی ہاؤس تھے۔ جہاں کسی نہ کسی ادبی موضوع پر ہمیشہ بحث ہوتی تھی۔ محمد شاہ رنگیلا نے چاندنی چوک کی نہر کے کنارے کچھ قہوہ خانے کھلوائے لیکن نادر شاہ اور ابدالی کے قتل عام کے بعد یہ بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ جو کچھ بچے تھے وہ جاٹوں اور مرہٹوں نے ختم کر دیے۔ انگریز کے راج میں قہوہ خانوں کی جگہ مشاعروں نے لے لی لیکن مشاعرہ ادبی اڈّا نہ تھا بلکہ تفریح کا مقام تھا۔ آزاد ہندوستان کا پہلا ادبی اڈّا کلکتہ شہر کے چورنگی چوراہے کے پاس ایک کمرے میں لگتا تھا۔ جس کا تفصیل سے ذکر نرادسی چودھری نے اپنی سوانح 'An Autobigrophy of an Muknown Indin' میں کیا

ہے۔اس اڈّے میں کوئی کرسی میسّر نہیں تھی صرف فرش پر ایک دری بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے میں ایک گھڑے میں پانی بمع ایک گلاس کے رکھا گیا تھا۔ بنگالی ناول ''دیوداس'' اکثر زیر بحث رہتا۔ کئی ادیب دور دراز سے آتے تھے گھنٹوں بیٹھ کر بغیر بحث میں حصّہ لیے واپس چلے جاتے تھے، یہ کہہ کر کہ کل پھر آئیں گے۔ سنیل گنگو پادھیائے، رامانند چٹرجی بھی کبھی کبھار اس اڈّے کی زینت بنتے۔ صورت گروں کا اڈّا علیٰحدہ ہوتا جس میں پرودوش داس گپتا، ٹیگور برادران اور درجنوں بنگالی آرٹسٹ جن پر سونار بنگلہ (جس کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں بدل چکے تھے) کا نشہ ابھی طاری تھا، مشرقی بنگال کی باتیں کرتے جب کلکتہ سے کہیں زیادہ ڈھاکہ ادب کا مرکز تھا۔ یاد رہے کہ نرادسی چودھری بھی مشرقی بنگال کے میمن سنگھ کے رہنے والے تھے، لیکن جب کلکتے نے انھیں اسکول ٹیچر کی نوکری کے لیے بھی ریجیکٹ (Reject) کر دیا تو وہ دلّی میں (موری گیٹ) کشمیری گیٹ کے پاس ایک کرائے کے مکان میں مقیم ہو گئے اور وہیں ان کا اڈّا لگتا تھا۔ ان کے مداح جوق در جوق ان کے گھر آتے اور ہر قسم کا موضوع زیر بحث ہوتا۔

For old unhappy and for off things
and battles long ago.

نرادسی چودھری کو دلّی بھی راس نہ آئی تو انھوں نے آخری ایام لندن میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی مہمان نوازی میں گزارے، لیکن آکسفورڈ میں بھی ان کے مداحوں نے نہیں چھوڑا۔ وہ ان کو دلّی کے کشمیری گیٹ اور کلکتے کی چورنگی والے اڈّوں کی یاد دلاتے، لیکن نراد بابو ان سے انگریزی میں یہی کہتے جس کا اردو ترجمہ ہے۔ ''یاد نہ کر دِل جزیں گزری ہوئی کہانیاں''

پاکستان بننے کے بعد ہم سیالکوٹ سے جموں۔ جموں سے دلّی اور پھر دلّی سے جالندھر پہنچے۔ یہاں کے لوگوں کی بولی عجیب قسم کی پنجابی تھی جو سیالکوٹ کی پنجابی سے مختلف تھی۔ حفیظ جالندھری کب کے پاکستان چلے گئے تھے اور اردو بھی یہاں دم توڑ رہی تھی۔ کچھ ادیب سرحد پار سے آئے تھے انھوں نے رینک بازار میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا اور ہر شام وہاں محفل لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے محفل اڈّے میں تبدیل ہو گئی۔ اس اڈّے کی زینت فکر تونسوی، مخمور جالندھری اور تاجور سامری تھے۔ دوسرے لوگ جو روزانہ آتے تھے ان میں پروفیسر کیدار ناتھ، جگدیش چندر، کلدیو ساہنی اور پھر راقم الحروف جو فرسٹ ایئر (First Year) کا کالج میں طالب علم تھا۔ کمرہ پہلی منزل میں تھا اور نیچے چائے کی دکان تھی۔ شاعر اپنی غزلیں سناتے۔ افسانہ نویس اپنے افسانے پڑھتے۔ جولاہور سے آئے تھے وہ سعادت حسن منٹو کو یاد کرتے۔ ایک شام کرشن چندر جو کسی رشتہ دار کو ملنے جالندھر آئے تھے اڈّے پر آ پہنچے۔ ان کا خیر مقدم مخمور نے اپنے اوور کوٹ سے وہسکی کے کوارٹر (Quarter) سے کیا۔ کرشن چندر نے اپنی کہانی 'تائی اسیری' پڑھ کر سنائی۔ تائی اسیری جالندھر کی رہنے والی تھی اور کرشن چندر تائی کے گھر میں ہی ٹھہرے۔

سردیاں شروع ہونے والی تھیں۔ دیوالی آ رہی تھی۔ دیوالی سے پہلے لوگ جوا کھیلتے ہیں اور چونکہ جوا غیر قانونی ہے پولیس جوا کھیلنے والوں کو پکڑ لیتی ہے۔ ادبی اڈّے پر اس شام ایک شاعر اپنی غزل سنا رہا تھا جس کا لب لباب تھا ''نظام بدل دو'' یاد رہے یہ وہ دن تھے جب نظام حیدر آباد پاکستان کے خواب لے رہا تھا۔ شاعر کو خوب داد مل رہی تھی۔

نیچے پولیس گشت لگا رہی تھی۔ شور وغل سن کر پولیس کا سپاہی اوپر پہنچا اور بولا۔ اچھا نظام حیدر آباد کی باتیں کر رہے ہو۔ چلو پولیس اسٹیشن۔ فکر صاحب نے کچھ کہنا چاہا، لیکن پولیس والے نے صرف یہ کہا کہ باقی ساری باتیں پولیس کے تھانے میں ہوں گی۔ بیل دار نے بہ آواز بلند پکارا۔ رینک بازار کی پارٹی حاضر ہو۔

''کیا کر رہے تھے یہ لوگ؟ جوا کھیل رہے تھے۔

''جوا تو معمولی چیز ہے حضور، یہ تو نظام حیدر آباد کی باتیں کر رہے تھے۔

ایک ادیب بولا کہ حضور ہم تو شاعر لوگ ہیں۔ سپاہی جب یہ سب کہہ رہا تھا کہ یک لخت ایس ایچ او کی نظر پروفیسر کیدار ناتھ پر پڑی جنھیں وہ اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ اس کی بیٹی جس کالج میں پڑھتی تھی وہیں پروفیسر کیدار ناتھ پڑھاتے تھے۔

ایس ایچ او سمجھ تو گیا کہ اس کے آدمیوں نے غلطی کی ہے، لیکن پولیس افسر کے ہوتے ہوئے وہ اپنی غلطی کا سب کے سامنے اعتراف کرنا اپنی ہتک سمجھتا تھا۔

لہٰذا اس نے پروفیسر صاحب کو دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھنے کو کہا اور باقی ادیبوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔ ''دیکھو بھائیو۔ ہندوستان اب آزاد ہو چکا ہے۔ اب شاعری وائری کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ایسے کام گورنمنٹ خود کرے گی۔ جاؤ لیکن یاد رکھو کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔''

جالندھر کے اس ادبی اڈّے کی اس واردات کو آج ۶۸ سال ہو گئے ہیں، لیکن کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ SHO شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ ملک کی اصلی پرابلمز غریبی، جہالت، بیماری، نابرابری ہیں۔ ایسے ماحول میں غالب کے اشعار یا منٹو کے افسانے بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا فکر

صاحب دلّی آ گئے، پروفیسر کیدار ناتھ جرمنی چلے گئے اور کرشن چندر نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے سلمٰی صدیقی سے عشق فرمانا شروع کر دیا۔ ادبی اڈّا اُجڑ گیا۔ جالندھر میں پھر کبھی کسی سر پھرے نے انقلاب کی باتیں نہیں کیں۔ گجرال صاحب بھی جالندھر کے رہنے والے ہیں، لیکن انقلاب کے چکّر میں نہیں پڑے۔

اب جگر تھام کے بیٹھو کہ دلّی کی باری آئی۔

کسی زمانے میں پرانی دلّی میں تو اڈّوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ آج بس کا اڈّا بھی وہیں ہے (ISBT)۔ لیکن نئی دہلی میں ادبی اڈّے صرف تین تھے ایک United Caffee House جن پتھ میں جہاں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا آتے تھے۔ دوسرا کناٹ پیلس میں جس کی رسم اجرا اندر کمار گجرال نے کی اور جہاں ادبی عورتوں کے لیے پردے کا خاص انتظام تھا۔ اس زنانہ ٹیبل پر ایک علیٰحدہ مضمون درکار ہے۔ ٹیبل زنانہ تھی لیکن گفتگو مردانہ ہوتی تھی۔ یہ تھا انڈین کافی ہاؤس جس کی چھت قناتوں والی تھی۔ تیسرا اڈّا موہن سنگھ پیلس کی چھت پر لگتا تھا، جہاں کافی ہاؤس بھی تھا۔

ریوالی سنیما سے تھوڑا آگے اور ہنومان مندر کے تھوڑا پیچھے۔ بابا کھڑک سنگھ مارگ پر۔ ہر شام گئے کھڑک سنگھ بلڈنگ کی کھڑکیاں ادیبوں سے کھڑکنے لگتی تھیں۔ بقول شخصے

کھڑک سنگھ کے کھڑکنے سے کھڑکتی ہیں کھڑکیاں
اور کھڑکیوں کے کھڑکنے سے کھڑکتا ہے کھڑک سنگھ

جوں جوں ادیب اوپر آتے وہاں ہر اڈّا ایک راؤنڈ ٹیبل کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ مثلاً اردو ٹیبل، ہندی ٹیبل، سیاسی ٹیبل پنجابی والے اکثر اردو ٹیبل پر آ جاتے تھے اور بحث مباحثوں میں پوری طرح شرکت کرتے تھے۔

یہ وہی اڈّا ہے جہاں جیالال اور گوربخش سنگھ گتھم گتھا ہوئے تھے۔ جہاں سنسار سنگھ گریب (غریب نہیں) نے شجاع خاور کی پلیٹ سے ایک کٹ لٹ (Culet) اٹھائی تھی اور ساجد صاحب عرف شجاع خاور کی پولیس والی رگ پھڑکی تھی اور گریب کو میڈیکل کرانے کی دھمکی دی تھی۔ گریب چونکہ گُٹ تھا۔ بات کو طول نہیں دیا گیا۔

اور پھر یہ وہی اڈّا ہے جہاں دیویندر ستیارتھی نے کراچی سے آئی ہوئی سارا شگفتہ کو موسلا دھار بارش میں اپنے لمبے اوورکوٹ میں لپیٹ لیا تھا۔ نیاز حیدر بھی یہاں آتے تھے اور پبلک کے پرزور اصرار پر اپنی نظم ''کورا کاغذ'' سنا کر ٹیبل لوٹ لیتے تھے۔ کرشن موہن اور گوپال متل جب بھی آئے ہوٹ ہوئے۔

اردو میں بل راجوں کی کمی نہیں۔ مثلاً بلراج مینرا، بلراج ورما، بلراج حیرت، بلراج کومل، بلراج کھنّہ۔ یہ سارے بلراج یہاں کسی نہ کسی کے تعاقب میں آتے تھے اور شکار نہ ملنے پر جلدی ہی اُٹھ جاتے تھے۔ قمر رئیس جن کا اصلی نام مصاحب علی خاں ہے، اسی زمرے میں آتے ہیں۔ فکر تونسوی پہلے تو کامریڈوں کی ٹیبل پر براجمان ہوتے تھے۔ پھر وہاں سے بور ہو کر پیاز کے چھلکوں سمیت اردو کی ادبی ٹیبل پر آ جاتے۔ جاتے جاتے کوئی نہ کوئی لطیفہ سنا جاتے۔ ایک دفعہ جب بیرا ان کے لیے کافی لانا شاید بھول گیا صرف پانی کا گلاس رکھ کر چلا گیا اور فکر صاحب اُٹھ کر جانے لگے تو پروفیسر رام لال دھوریا جو P.G. DAV. College میں انگریزی پڑھاتے تھے نے کہا۔ فکر صاحب کافی تو پیتے جایئے۔ فکر صاحب نے جواباً کہا۔ ''جو پی لیا وہی کافی ہے۔'' وضاحت کر دوں کہ P.G. DAV College پوسٹ گریجوٹ کالج نہیں ہے، اس کا نام ہے پنا لال گردھاری لال کالج، جہاں بلراج مدھوک اور وجے کمار ملہوترا بھی پڑھاتے تھے۔ یاد رہے کہ بلراج مدھوک دلّی کے مشہور M.P تھے اور وجے کمار ملہوترا نے کئی سال بعد نئی دلّی سے ڈاکٹر من موہن سنگھ کو ہرایا تھا۔ ایک آدھ بار وہ بھی آتے تھے۔ ایک شام جب محفل سجی ہوئی تھی اور کوئی کافی منگوا نہیں رہا تھا۔

بات فیض پر چل نکلی

آخر کون سی گیدڑ سنگھی تھی فیض کے پاس کہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے وہ انقلابی شاعر قرار دے دیے گئے۔

جوگا سنگھ نے صرف ایک کافی کا آرڈر دیتے ہوئے سنسار سنگھ گریب سے پوچھا، جوگا سنگھ پنجابی کا شاعر ہے اور جگا ڈاکو کے بارے میں ایک ہی طویل نظم سے مشہور ہو گیا:

جگا جمیاتے ملن ودایاں
تے وڈا ہوکے ڈاکے ماردا

جگا جب پیدا ہوا تو لوگوں نے مبارک باد دی، لیکن بڑا ہو کر وہ ڈاکے مارنے لگا۔

پنجابی کا شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ اردو کا اچھا شعر سننے کے لیے گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ ایک انقلابی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور کناڈا سے سکھوں کا جو سمندری جہاز ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے چلا تھا، اس کے سربراہ اس کے دادا تھے۔ جوگا سنگھ کو شکایت ہے کہ اس کے دادا کا نام ہردت سنگھ تاریخ میں نہیں آیا۔ انھیں تو پھانسی کی سزا ملی تھی۔ لہٰذا اس کا یقین انقلاب سے اُٹھ چکا ہے۔

اب وہ دیوی جاگرن کراتا ہے۔ افسر کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ رات کو دن اور دن کو رات کہتا ہے۔ پھکن والے قصّے پر عمل کرتا ہوا دو پروموشن

لے چکا ہے۔ پارٹ ٹائم جیوتش بھی کرتا ہے۔جنم پتریاں بنواتا ہے۔ بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ بیوی ٹیلی فون کے دفتر میں کام کرتی ہے۔

قصّہ کوتاہ وہ ڈی ڈی اے کے فلیٹ میں رہتا ہے اور انگریزی فلمیں دیکھتا ہے۔ پنجابی میں اس کی گرودوارہ شاعری کافی پسند کی جاتی ہے۔

بھلا کیا یہ سب کچھ انقلاب سے ممکن تھا۔ جوگا سنگھ کا معاملہ کافی سنجیدہ ہے۔اردو ٹیبل والے اس کی عزت کرتے ہیں۔تاراسنگھ کامل بھی ہر روز آتے تھے، لیکن ان کا معاملہ قدرے پیچیدہ ہے۔ پہلے پورے سال کا کرایہ انھوں نے اپنے مالک مکان کو نہیں دیا تھا یہ کہہ کر کہ جب میری کتاب پر پنجابی اکیڈمی والے ایوارڈ دیں گے تو سارا کا سارا کرایہ ایک ہی بار دے دوں گا اور مالک مکان جوتارا سنگھ کی کویتا کا مداح تھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔ تاراسنگھ کوئی بات نہیں۔ میں نے ویسے ہی کرایہ کی بات کہی تھی اور تاراسنگھ اپنے بائیسکل سمیت کافی ہاؤس میں آجاتا۔ جوگا سنگھ کہتا ہے کہ انقلاب کوئی تلا ہوا قلیچہ نہیں جو ہر ڈھابے پر بکتا ہے۔ انقلاب بہت مہنگی شے ہے، جو امیروں اور اسمگلروں کی ذہنی عیاشی کا سامان بن کے رہ گیا ہے۔

اسی لیے جوگا سنگھ بے تاب ہے اس سوال کے جواب کا کہ فیض کے پاس کون سا ایسا مقناطیس تھا کہ سارا برصغیر اس کو انقلابی شاعر ماننے کے لیے تیار تھا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فیض کا انقلاب محض ایک ادبی پکنک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، لیکن جس سے جوگا سنگھ نے یہ سوال پوچھا اس کا کیس کچھ ٹیڑا ہے۔یعنی سنسار سنگھ کریب۔

گریب پنجابی کا شاعر ہے لیکن اس کا اردو تلفظ بیشتر اردو والوں سے بہتر ہے۔ اس نے اپنا تخلص اپنے بریف کیس (جو اسے گورنمنٹ کی طرف سے ملی ہے) پر کھدوا رکھا ہے۔ وہ بھی انقلاب لانا چاہتا تھا لیکن ایک دن اس کے افسر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا۔ ''سنسار سنگھ کچھ دیر کے لیے انقلاب کو روک لو۔ تمہارا نام پروموشن کے پینل میں آچکا ہے۔ وہ دن اور یہ دن۔ سنسار سنگھ نے انقلاب کا لفظ اپنے لغت سے خارج کر دیا، لیکن پھر بھی وہ کہتا ہے کہ انقلاب ان بدلتے ہوئے حالات میں یا تو طوائف کے کوٹھے سے اُٹھے گا یا پھر ڈی ایم ایس کے دودھ کی 'کیو' سے۔ انقلاب لانے کے لیے ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ لگانا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی انقلاب نامی اخبار پڑھنا۔

اتنی دیر میں چانن گوبند پوری وارد ہوئے اور گریب انقلاب کو چانن کے حوالے کرتے ہوئے ٹیبل سے اُٹھ گیا۔ اپنی پگڑی سیدھی کرتے ہوئے اور راجہ نل کی قسم کھاتے ہوئے ست سری اکال And copy to all (اینڈ کاپی ٹو آل)۔ یہ جادو جا۔ چانن گوبند پوری عرف سی آر چانن مصنف ''غزل ایک ادھین'' کافی مقبول ہوئی کا عقیدہ ہے کہ پنجابی زبان اور ادب کی نشو ونما سکھوں سے زیادہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے کی ہے۔ چانن صاحب کی غزلیں ہر صبح ویڈیو پر پشپا ہنس اور اجیت کور گاتی تھیں۔ جب میں نے ان کو استاد دامن کی موت کی اطلاع دی تو ساری شام ان کو ایک چپ سی لگ گئی۔ اب ان کا سارا گزارہ پنشن پر ہے اور انقلاب کی باتیں چھوڑ دی ہیں۔ جب بھی کبھی انقلاب کی بات ہوتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اب انقلاب کا محکمہ میں نے نادان صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔

بھئی ایک ہی تو شاعر ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ نادان ان کا تخلص ہے۔ نام ہے اندر سروپ دت مہیال برہمن۔ قد ۶ فٹ چار انچ۔ انڈین ائیر فورس میں ایئر مین سے شروع ہوئے تھے۔ راول پنڈی میں جب وہ بھرتی کے دفتر میں پہنچے تو ان کے پاس صرف دو چیزیں تھیں۔ دل محمد کی گیتا اور سرحدی چاقو، افسر دونوں چیزیں دیکھ کر ڈر گیا اور بغیر کسی سوال جواب کے نوکری کے لیے چن لیا۔ ترقی کرتے کرتے وہ I.A.S کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور وزارت داخلہ میں ڈپٹی سکریٹری ریٹائر ہوئے۔ ان کا مجموعۂ کلام 'لہو پکارے گا' کافی مقبول ہوا لیکن جس واردات نے انھیں شہرت دی تھی وہ تھی شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ ہاتھا پائی۔ واقعہ اوبرائے ہوٹل کا ہے جہاں کرشن موہن کی کتاب ''کوئے ملامت'' کی ریلیز کے بعد وہسکی پانی کی طرح بہائی گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ نادان نے اپنی ایک نظم ''شب خون'' کو جو فاروقی کی بیوی کے نام سے شائع ہو رہا تھا بھیجی تھی لیکن فاروقی نے ریجیکٹ کر دی۔ پھر کیا تھا رنج سے جب گفتگو ہونے لگی۔ تم سے تو ہونے لگی۔ چھ فٹ چار انچئے نادان نے چار فٹ چھ انچئے کے علامہ مختصر کو اور مختصر کر دیا۔ اس کو گلے سے پکڑ لیا اور پوچھا ''بتا تیری رضا کیا ہے۔'' اس اثنا میں دوسرے ادیب بیچ میں آگئے اور نادان کو برا بھلا کہا، لیکن نادان وار کر چکا تھا۔ اردو شاعری شراب آلودہ ہوگئی۔ فنکشن فیل ہوگیا۔ نادان اس شام ہیرو تھا اور جدید ادب بقول قاضی عبدالستار اردو ادب کا بدگوشت، موہن سنگھ کافی ہاؤس میں یہ قصّہ کافی بار دہرایا گیا اور ہر بار نادان صاحب نے کوئی نیا نکتہ نکالا اور بقول قرۃ العین حیدر پورب دیس کے ارسطوئے آخر الزماں ڈاک خانے کی مہر کی طرح مدھم پڑھ گئے۔

نادان صاحب کا عقیدہ ہے کہ ادب میں ۲۳ شعر بھی اگر اچھے ہوں تو چل نکلتے ہیں لیکن انقلاب کے لیے تو صرف ایک شعر ہی کافی ہے، لیکن انقلاب کا رنگ کیا ہوگا۔ لال جو گیا، ہرا، پیلا یا جامنی جو نارنگ صاحب کا پسندیدہ رنگ ہے۔

میں انقلاباں چوں انقلاب لیاندا
تے بھابی تیری گل ورگا

لال گالوں والی بھابی تو پاکستان میں رہ گئی۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے اس کے گال پچک گئے، لیکن گلہ تو اپنے بھائی سے ہے۔ بھائی تو ایک بکری ہے جو پانی پیتی ہے اور بچے پیدا کیے جاتی ہے۔ ''میری اس گھر میں ڈولی آئی اور ارتھی بھی یہیں سے نکلے گی۔''

نادان آج چپ ضرور ہے۔ دفتر میں لے دے ہوگئی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ آج فیض صاحب نادان کے ہاتھوں بچ گئے ورنہ اس کے انقلاب کا بھارتیہ کرن کر دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ چین میں انقلاب کو امریکہ لایا تھا اور افغانستان میں روس۔ جوں جوں ان کی پنشن نزدیک آتی جاتی ہے ان کا عقیدہ انقلاب میں اور پختہ ہوتا جاتا ہے۔

اور اگر انقلاب کا مطلب کھانسی ہے تو ڈاکٹر محمد یعقوب (جو ہر حالات میں شام ڈھلے موہن سنگھ پلیس میں پائے جاتے ہیں) کے پاس شرطیہ علاج ہے اور ریڈی نسخہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی پرگتی شیل کوی تھے آج صرف شیل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمان ہے کہ انقلاب ہمارے ملک میں کبھی آیا ہی نہیں۔ چھوٹے موٹے بوٹ کلب ٹائپ آندولن ضرور آئے ہیں۔ مار کٹائی بھی ہوئی ہے اور لاٹھیاں بھی چلی ہیں، لیکن عین وقت پر جب انقلاب آنا ہوتا ہے۔ کچھ انیس اکیس ہو جاتا ہے۔

محسن زیدی اس تھیوری کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ انقلاب کوئی ٹائم بم نہیں ہے جو عین وقت پر پھٹے گا۔ دبے پاؤں نہیں بلکہ اعلانیہ آئے گا، لیکن دفتر میں جب ان کا بھی پروموشن ہو گیا تو وہ دبے پاؤں رُک گیا۔ لو اقبال عمر صاحب آ گئے۔

اقبال عمر لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بھائی بھی شاعر ہیں۔

اقبال اُن کے چھوٹے بھائی ہیں لیکن شاعر بڑے ہیں۔ دلّی میں جمنا کالونی میں ایک کمرے کے مکان میں رہتے ہیں، لیکن باتیں جمنا کی نہیں بلکہ گومتی کی کرتے ہیں۔ اقبال صاحب سے اکثر اس ٹیبل کی یہی درخواست ہوتی ہے۔ حرف معتبر والا شعر سنائیں۔

وہ حرفِ معتبر تھا جو نکلا تھا برملا
یہ اور بات ہے کہ لہو تھوکنا پڑا

اقبال صاحب بہت کم بولتے ہیں لیکن جب بھی بولتے ہیں ان کو بڑے دھیان سے سنا گیا، لیکن کچھ بھی ہو فیض صاحب کا انقلاب کھوٹے پیسے کی طرح چل نکلا۔ بیچ میں گوبند بول پڑا۔ کیا یہ سچ ہے کہ فیض صاحب چھپکلیوں سے ڈرتے تھے۔ گوبند دلّی یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا ہے اور چانن کو اپنا استاد مانتا ہے۔ جب کسی نے کوئی جواب نہ دیا تو خود ہی وضاحت کرنے لگا۔

''میجر محمد اسحاق (فیض صاحب کے جیل کے ساتھی) کے بیان کے مطابق فیض چھپکلیوں سے خوف کھاتے تھے۔ چھپکلی کو دیکھ کر وہ ادھر اُدھر چکر کاٹنا شروع کر دیتے تھے۔ عطا کی چارپائی نزدیک ہی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ فیض صاحب بار بار چھت کی طرف دیکھ رہے ہیں اور گھوم پھر کر وہی عمل دہراتے ہیں۔ ایک ہنگامہ سا ہو جاتا ہے اور جب عطا نے چھپکلی کو دیکھا تو فیض صاحب کی چارپائی کھینچ کر ایک طرف کر دی۔''

خواجہ احمد عباس بھی انقلاب کے حامی تھے لیکن وہ مینڈکوں سے ڈرتے تھے۔ ''بھائی غضب کر دیا۔'' محمد عصیم جوترقی اردو بورڈ میں ریسرچ اسسٹنٹ ہے، نے ٹیبل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ''صرف کافی سے کام نہیں چلے گا، کم سے کم کلٹ ہو۔''

گوبند نے بیرے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ہوا میں خنکی تھی اور بارش کا امکان تھا۔

عین اس وقت کرشن موہن انکم ٹیکسیا (انکم ٹیکسیا ان کا تخلص ہے) اب تو ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن ۱۲۳ انقلاب لانے کے بعد وارد ہوئے اور خدمات کے لیے کئی پارٹیاں دے چکے ہیں اور کئی انعامات لے چکے ہیں۔ لدھیانہ کی ہیرو سائیکل سے لے کر جالندھر کی گُرمنڈی تک۔ جب بھی کافی ہاؤس آتے ہیں اپنے نئے مجموعے کے بکسے بھر کر لاتے ہیں۔ ہر ایک کو دیتے ہیں سوائے میرے۔ ایک بار تو میں نے کہہ دیا۔ ''کرشن موہن صاحب اور بھی ہیں تشنہ لب پیغام کے'' کرشن موہن پگھل گئے اور مجھے اپنی نئی کتاب ''من کے منکے'' پیش کی۔ اس دن انھوں نے سب کے لیے ایک ایک پلیٹ کٹ لٹ منگوائی اور سوامی (بیرا) کو دس روپے کے نوٹ کی ٹپ دی۔ اس دن سے سوامی کرشن موہن کا داس ہو گیا۔ کرشن موہن بھی جوگندر پال کی طرح اپنے آپ کو سیالکوٹ کا بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فیض کی اردو ناقص تھی۔ جگہ جگہ غلطیاں ہیں۔ اکثر اشعار مفہوم سے عاری ہیں۔ آرائش لفظی کی بہتات ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کے بے وجہ استعمال نے ان کی شاعری کو ہلکا بنا دیا ہے۔ اس بارے میں اگر آپ مزید جاننا چاہتے ہیں تو رشید حسن خان کو پڑھیے۔ یہ الزام تو ڈاکٹر اقبال پر بھی لگ سکتا ہے۔ مثلاً

''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی''

اب ''آپ ہی خودکشی کرے گی'' تو ایسے ہوئی جیسے لڑکے سائنس روم کے کمرے سے باہر نکل رہے ہیں یا روزے ماہ رمضان کے مہینے سے شروع

ہوتے ہیں۔ ایک نامعلوم آواز اُٹھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ آواز بشیر احمد درزی کی تھی، ایک مجموعہ بھی جن کا چھپ چکا ہے۔

اقبال کو دار ورسن کے لالے تو نہیں پڑے تھے، لیکن ان کو بچانے والے بہت تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کچھ تو اپنی سزا کو پہنچ گئے کچھ اپنی جزا لے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فیض صاحب فیض ایوبی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اوران کا انقلاب عشق کی حد کو پار نہ کر سکا۔ چاند نے اکثر فیض صاحب کے کانوں میں کچھ نہ کچھ کہہ ڈالا اور فیض صاحب نے جھکے ہوئے چاند کو اور جھکا دیا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ محبت حسین آنسو وارد ہوئے۔ اپنے لیے ایک کرسی گھسیٹتے ہوئے۔ محبت حسین آنسو کی تقدیر میں محبت کم اور آنسو زیادہ تھے دولت رام زخمی کی طرح جن کی زندگی میں دولت کم اور زخم زیادہ ہیں چھوٹے قد کے ہیں اور بات بھی چھوٹی اور صاف کرتے ہیں۔ دانتوں کی پلیٹ مصنوعی ہے۔ پھر بھی ان کی ہنسی جعلی نہیں ہے، لیکن سر کے بال قائم ہیں۔

جوگندر پال جن کو کافی ہاؤس ان کی بیوی کرشنا پال لاتی تھیں، صرف ایک گھنٹے کے لیے۔ خود شاپنگ کرنے چلی جاتیں اور پال صاحب موہن سنگھ پلیس کی چھت پر آجاتے۔ پال صاحب جب بھی آتے ان کا استقبال کیا جاتا۔ ان کا کہنا تھا کہ فیض اردو ادب کے ہملٹ تھے۔ وہ شاعری کے بجائے اگر افسانے لکھتے تو کہیں کے کہیں پہنچ جاتے۔ اگر ایسا ہوتا ان کو بیروت، لندن، ماسکو جانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ اپنے گاؤں کالا کادر (سیالکوٹ) میں بڑے آرام سے افسانے لکھتے جہاں میراثی ان کا حقّہ بھرتا اور میراثن ان کے پاؤں دبا دیتی۔

پال صاحب کی کہانی کانسیپٹ (Concept) کافی ہاؤس میں اکثر زیر بحث رہتا۔ وہ کہتے تھے کہ میں کہانی نہیں لکھتا کہانی مجھے لکھتی ہے۔ سریندر پرکاش جب بھی دلّی آتے تو کافی ہاؤس میں پال صاحب کے بارے میں یہ شعر دہراتے:

پال پہلے سے آکے بیٹھا ہے
سالہ دھونی رما کے بیٹھا ہے
اک کہانی سنانے والا ہے
اک کہانی سنا کے بیٹھا ہے

کہتے ہیں جب یہ شعر جوگندر پال تک پہنچایا گیا تو انھوں نے فیض کا ہی شعر دہرا دیا:

آخر شب کے جاگنے والو
کیا کروگے اگر سحر نہ ہوئی

ایک دن جب پال صاحب کافی ہاؤس آئے تو بہت اُداس تھے۔ کسی نے پوچھا کہ پال صاحب آج آپ وقت سے پہلے آ گئے۔

کہنے لگے یہ وقت بھی عجیب چیز ہے آنے سے پہلے ہی بیت جاتا ہے۔ ایک آواز نے جواباً عرض کیا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ زندگی کا اٹوٹ حصّہ ہے۔

زندگی اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔ گھومتی ہے گڑگڑاتی ہے۔ پھر ایک دن یہی وقت زندگی کو اپنے ساتھ لے کر ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔

دیال سنگھ کالج کے پنجابی کے پروفیسر رنجیت سنگھ سے رہا نہ گیا۔ فوراً حرکت میں آ گئے اور بولے۔ ارے ارے یہ تو بابا فرید کا اشلوک ہے کہ زندگی ایک دلہن ہے جسے موت کا دولہا لینے آیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ بحث طول پکڑ لے لیکن سوامی بیرا کافی لے آیا تھا اور موہن سنگھ پلیس کی کافی کے بارے میں مشہور ہے:

ساری خدائی ایک طرف
موہن سنگھ کی کافی ایک طرف

لہٰذا بحث ملتوی کر دی گئی اور ویسے بھی پال صاحب کی گاڑی آ چکی تھی۔ بات خواہش اور ضمیر کی نہیں بلکہ گفتار اور کردار کی ہے۔ کہنے اور عمل کی ہے۔ اب فیض صاحب کی کم گوئی کو ہی لیجیے۔ فیض صاحب پاکستان سے باہر نکلے، بولنا شروع کر دیا۔ لندن میں تو کیا کیا باتیں کر جاتے۔ ماسکو میں تو انھوں نے اپنی کشتی کئی بادبانوں کے سپرد کر کے دریائے ماسکو میں غوطے لگائے۔

''فیض صاحب کی پہلے دور کی شاعری نہایت ہی قسمیہ قسم کی شاعری ہے۔'' شکیب نیازی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ شکیب صاحب نے ڈاکٹر قمر رئیس (جن کا اصلی نام مصاحب علی خاں ہے) کی شاگردی میں کرشن چندر پر پی ایچ ڈی کی ہے اور سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف زبانِ میسور میں ریسرچ اسسٹنٹ ہیں۔ جب بھی دلّی آتے ہیں تو کافی ہاؤس ضرور آتے ہیں۔ قسمیہ قسم کی شاعری کا مطلب ہے: بار بار قسمیں کھاتے ہیں۔ ہر شعر میں اقرار ہے۔ ویسے بھی ''نہ'' کہنا انھوں نے کبھی سیکھا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی لڑکیاں ان کو غلط سمجھ بیٹھیں اور کئی نے اپنے تکیے آنسوؤں سے گیلے کیے۔

شکیب صاحب کا فرمان ہے کہ نوجوانی کے عہد میں فیض صاحب ریاضی میں کمزور تھے۔ غمِ جہاں کا حساب کرنا شروع کرتے تو کسی دوسرے حساب میں کھو جاتے۔

لسانی سانچوں کو رومانی سانچوں پر قربان کر دیتے اور پھر وہی ہوتا جس کا انھیں ہمیشہ ہی ڈر رہتا یعنی کچھ نہ ہوتا۔ اس ہونے نہ ہونے نے غالب کو ہی

ڈبویا بلکہ سریندر پرکاش بمبئی والے کے مطابق کئی اور بھی ڈوبے۔ سریندر پرکاش کا ''بجوکا'' کافی مقبول ہوا۔ جیسے بلراج مینرا کی ''ماچس'' یہ دونوں کافی ہاؤس میں آتے کم اور جاتے زیادہ تھے۔ ادبی سراغ رسانوں کا کہنا ہے کہ فیض صاحب جب بھی بازار جاتے پبلشروں سے کبھی نہیں ملتے تھے اور نہ ہی کوئی خریداری کی۔ بازار سے گزر راہوں خریدار نہیں ہوں۔ جیسے گئے ویسے آ گئے۔

شکیب صاحب کی ایک اور تھیوری ہے کہ ادیب کی جسمانی صحت اچھی ہو تو وہ کبھی انقلاب نہیں لاسکتا۔ لہٰذا نادان صاحب، جوگندر پال، سریندر پرکاش، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، جاوید اختر سے کوئی خدشہ نہیں البتہ ڈاکٹر یعقوب سے خبردار رہیے۔ حالات نے انھیں گیہوں کی طرح پیس کر رکھ دیا ہے۔ ندا فاضلی کبھی کسی کافی ہاؤس میں نہیں گئے، لیکن کئی انقلابی غوطے لگائے۔ آخر میں خود غوطہ کھا گئے۔ دلّی میں جب بھی وہ آتے اور جہاں بھی ٹھہرتے وہی ادبی اڈّا بن جاتا۔ آنسو صاحب یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ جس ملک میں سانپ کو بھی دودھ پلانے کا رواج ہو وہاں زہر گھولنے کی جلدی کیا ہے۔ سچ بولنے کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔

اس ادبی اڈّے کی تفصیل نامکمل رہے گی اگر اس مضمون میں دیویندر ستیارتھی کا نام نہ لیا جائے۔ گرودیو ہر روز آنے والوں میں تھے۔ ان کے پاس ایک جھولا تھا جس میں اخبارات کے تراشے، ایک لکھنے والی کاپی اور کئی قسم کے قلم ہمیشہ موجود رہتے۔ ایک لمبا کوٹ پہنتے تھے اور اقبال، ٹیگور، پریم چند سے نیچے والے ادیبوں سے نالاں تھے۔ فیض کو تو وہ نہ تینوں (۳) میں نہ تیروں (۱۳) میں سمجھتے تھے۔ کہتے تھے فیض کچا گھڑا ہے بہت جلد ڈوب جائے گا۔ گرودیو کو ساری دلّی جانتی ہے۔ بس کنڈیکٹر ان سے کبھی ٹکٹ نہیں مانگتا۔ کافی ہاؤس میں تو ہر شخص ان کو کافی پلانا فخر سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ بیرا بشن بھی ان سے پوچھتا ہے۔ ''گرودیو کیا جب انقلاب آئے گا تو مجھے ٹپ زیادہ ملے گی''؟

کافی ہاؤس کی روشنیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔ بیرے اپنی وردیاں اُتار چکے تھے اور بڑی تیزی سے دوسرے دن کے انقلاب کے لیے سمیٹ رہے تھے۔

موہن سنگھ پیلس کی شمعیں گل کر دی گئیں اور کافی ہاؤس کے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر دیا گیا۔

بشن کل نہیں آئے گا کیونکہ کل اسے اپنی بیوی کو اسپتال لے جانا ہے اور دلّی کے اسپتالوں کی حالت یہ ہے کہ جتنے مریض وہاں جاتے ہیں اتنے واپس نہیں آتے۔

جاتے جاتے یہ واضح کر دوں کہ میں نے اس ساری بحث میں کوئی حصّہ نہیں لیا اور کسی نے مجھ سے کوئی سوال بھی نہیں پوچھا۔ ویسے بھی اس کافی ہاؤس کی خاصیت ہے کہ سوال نہ پوچھنا اور جواب نہ دینا جرم نہیں سمجھا جاتا۔ ویسے بھی سننے والوں کی تعداد موجودہ ماحول میں کم ہو رہی ہے اور بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ۔ آج دلی کے سب ادبی اڈّے ختم ہو چکے ہیں۔ صرف ایک غیر ادبی اڈّا رہ گیا ہے جسے انگریزی میں ISBT کہتے ہیں۔ انٹر اسٹیٹ بس ٹرمینل یعنی بس اڈّا یا پھر میر درد سڑک کے سامنے گھوڑے تانگے والا اڈّا اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے والا اڈّا.....اور سب سے آخر میں اس ادیب کو پیش کرتا ہوں جس کی موجودگی اور ریسرچ سے دلّی کے درجنوں چائے خانوں اور کئی کافی ہاؤسوں کے اڈّوں میں ایک نئی لہر وجود میں آئی تھی۔ دلّی کے اس دیوانے کا نام ہے عظیم اختر جس کی رگ رگ میں دلّی بسی ہوئی ہے۔ لالہ مہیشور دیال اور آروی سمتھ کی طرح لیکن جہاں ان دونوں دلّی نوازوں نے کسی ادبی اڈّے کی رونق میں اضافہ نہیں کیا، عظیم اختر بے خطر کود پڑا عوامی اردو اڈّوں پر اور اس زبان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔ جہاں جہاں گیا، جس جس اڈّے کو زندگی دی اس میں کوئی نہ کوئی نیا پن تھا۔ چاہے وہ سمیع اللہ کی دکان کی تاریخی بنچ ہو یا سلیمان ٹی اسٹال یا شفا دہلوی کی بیٹھک جہاں صبح کو مریضوں اور شام ڈھلے شاعروں کی نشست لگتی تھی۔

عظیم اختر ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کے والد مولوی علیم اختر مظفر نگری کے پھاٹک حبش خاں والے گھر میں محفل لگتی تھی۔ فراق گورکھپوری جب بھی دلّی آتے تو علیم اختر کے اڈّے پر جلوہ افروز ہوتے۔ عظیم اختر نے ایسے ماحول میں اپنا بچپن گزارا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی نوکری کرتے ہوئے بھی انھوں نے خودداری اور خودی کا دامن نہیں چھوڑا، کسی قسم کا کوئی ادبی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ دلّی پر دلّی والوں پر، ان کا طنز بھی شائستہ ہے۔ ذاتی زندگی میں ان کا اپنا مقام ہے۔ پانچ نمازیں پڑھتے ہیں۔ انگور کی بیٹی ان کے گھر کی دہلیز تک نہیں آئی۔ ان کے اندر ایک دردمند دل دھڑکتا ہے۔ اس دردمندی کا یہ عالم ہے کہ کئی نقطوں اور نظریوں کے اختلاف کے باوجود جو عزت عظیم اختر نے مجھے دی ہے شاید ہی کسی اور ادیب نے دی ہو۔ ساتھ ہی ان بدلتے ہوئے حالات میں جہاں آسمان کے ستارے بھی بدل گئے ہیں وہ ایک نئے اردو ادبی اڈّے کا آغاز کریں گے اور ہندوستان کا مشترکہ کلچر اپنے ماضی کی بلندیوں کو پھر سے چھوئے گا۔ بقول کرشن گوپال چنڈی گڑھیا:

''یہ خوشبو پیار کی آئی کہاں سے
یہ ہے اردو زباں ہندوستاں سے''

○○